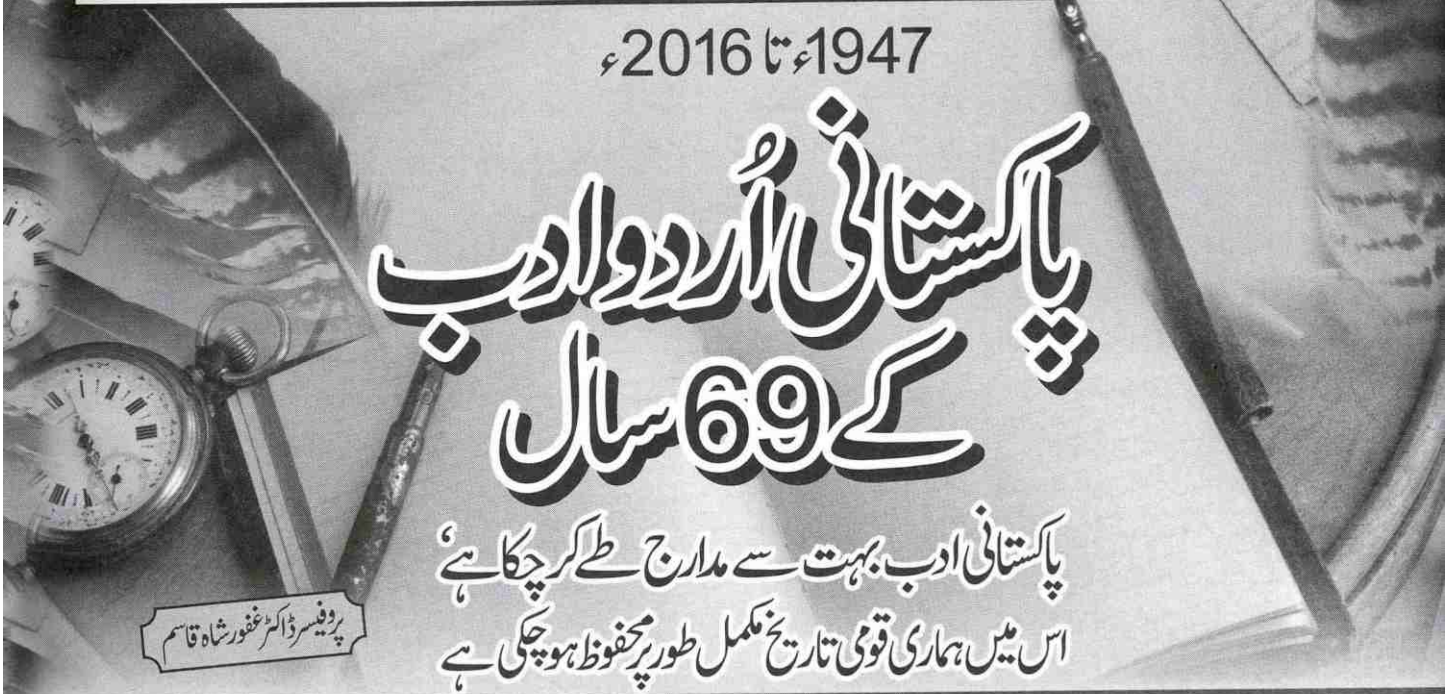

1947ء تا 2016ء

پاکستانی اُردو ادب کے 69 سال

پاکستانی ادب بہت سے مدارج طے کر چکا ہے‘ اس میں ہماری قومی تاریخ مکمل طور پر محفوظ ہو چکی ہے

پروفیسر ڈاکٹر غفور شاہ قاسم

اس مقالے کے آغاز میں ہم سب سے پہلے پاکستانی ادب کی تعریف متعین کرنا چاہیں گے۔

پاکستانی ادب سے مراد وہ ادب ہے جو پاکستان کے وجود‘ پاکستان کے وقار اور پاکستان کے نظریے کا اثبات کرتا ہو اور جو پاکستان کے تہذیبی اور تاریخی مظاہر کا ترجمان ہو اور جو یہاں کے کروڑوں باشندوں کی امنگوں‘ آرزوؤں‘ کامیابیوں اور کامرانیوں‘ ناکامیوں اور محرومیوں کا عکاس ہو۔ پاکستانی ادب ایک مخصوص فضا‘ مخصوص ماحول‘ مخصوص رنگ اور مخصوص لب و لہجے کا حامل ہے جو پاکستانی ادیبوں نے تخلیق کیا اور جس میں پاکستان کی تاریخ، روایات‘ حالات‘ تہذیب و ثقافت‘ پس منظر اور پیش منظر مکمل طور پر موجود ہے۔ پاکستان کی علاقائی زبانوں کے علاوہ انگریزی زبان میں معرضِ تحریر میں آنے والا پاکستانی ادیبوں کا ادب بھی یقیناً ”پاکستانی ادب“ کہلائے گا۔ ڈاکٹر سلیم اختر کا خیال ہے کہ

”پاکستانی ادیب کا لکھا ہوا وہ ادب جس میں پاکستانی قوم کے مسائل و مصائب کا تذکرہ ہو یا جس سے پاکستانی قوم کا تشخص اُجاگر ہوتا ہو اسے پاکستانی ادب قرار دیا جا سکتا ہے۔“

بلاشبہ پاکستانی ادب بہت سے مدارج طے کر چکا ہے یہ بہت سی منزلیں عبور کر آیا ہے۔ یہ بہت سے واقعات اور سانحات کا عینی شاہد ہے اس میں ہماری قومی تاریخ مکمل طور پر محفوظ ہو چکی ہے۔ پاکستانی مزاج سمجھنے کے لیے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

قیامِ پاکستان 1947ء سے لے کر اب تک پاکستانی قوم جن جن مراحل سے گزری ہے اُن میں 1958ء‘ 1965ء‘ 1971ء‘ 1998ء، 1999ء اور پھر 9/11 میں پیش آنے والے واقعات نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔ پاکستانی ادب کے خدوخال اور نقوش مندرجہ بالا برسوں میں پیش آنے والے واقعات نے وضع کیے ہیں۔ آیندہ سطور میں ہم پہلے شعری ادب اور بعدازاں نثری ادب کے تناظر میں پاکستانی ادب کا مطالعہ پیش کریں گے۔ یہ اُنہتر 69 برس کی داستان ہے اس لیے اختصار میں جامعیت کے پہلو کو مدنظر رکھا جائے گا۔ یہ جائزہ بلحاظِ اصناف پیش کیا جا رہا ہے۔

نعت

نعت قیامِ پاکستان کے بنیادی تصور اور نظریے سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہے۔ چنانچہ نعت پاکستان کی سب سے ممتاز صنفِ سخن بنتی جا رہی ہے۔ گزشتہ 69 برسوں میں نعت گوئی کا رجحان اتنا فروغ پذیر ہوا ہے کہ ہمارے جو شاعر غزل اور نظم میں اپنی حیثیت منوا چکے تھے وہ بھی نعت کہنا اپنے لیے باعث افتخار سمجھنے لگے ہیں اور اُنھوں نے نہایت ایمان افروز اور کیف آفریں نعتیں کہی ہیں‘ جن کے ایک ایک شعر سے اُن کی حضور نبی اکرمؐ سے والہانہ عقیدت کا اظہار ہوتا ہے۔ قیامِ پاکستان کے وقت متعدد ایسے شاعر موجود تھے جو نہ صرف یہ کہ نعت کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے بلکہ نعت گو کی حیثیت سے معروف ہو چکے تھے ان میں ضیاء القادری‘ بہزاد لکھنوی‘ ماہر القادری‘ شمس مینائی‘ درد کاکوروی‘ محمد ذکی کیفی‘ راجہ محمد عبداللہ نیاز‘ اثر صہبائی اور اسد ملتانی کی سطح کے ایسے متعدد شعراء تھے جنھوں نے نعت کے فروغ و ارتقا میں مقدور بھر حصہ لیا۔

پاکستان میں نعت گوئی کا دورِ اولیں انہی شعرا پر مشتمل ہے۔ دوسرا دور جنگ ستمبر 1965ء سے کچھ عرصہ قبل عبدالعزیز خالد کے نعتیہ مجموعہ ”فارقلیط“ کی اشاعت سے شروع ہوا۔ یہ دور پہلے دور کی نسبت وقیع اور شان دار ہے۔ اس دور میں حافظ مظہر الدین‘ حافظ لدھیانوی‘ حفیظ تائب‘ راسخ عرفانی اور متعدد دوسرے نعت گو شاعر نعتیہ ادب کے اُفق پر نظر آتے ہیں جنھوں نے اپنی تمام تر شعری صلاحیتوں کو نعت گوئی کے لیے وقف کر دیا اور نعت کے فن‘ ہیئت اور اسلوب میں وسعت اور تنوع پیدا کیا۔

شروع شروع میں نعت گوئی کے ضمن میں ترقی پسند شعرا کا رویہ بے اعتنائی کا رہا لیکن بعدازاں کچھ ترقی پسند شعرا نے بھی صنفِ نعت میں طبع آزمائی کی۔ ان شعرا میں سب سے نمایاں نام احمد ندیم قاسمی کا ہے۔ قیامِ پاکستان کی دوسری دہائی میں انھوں نے اپنے افکار و نظریات کے اظہار کے لیے نعت گوئی کو اپنایا اور اعلیٰ نعتیں لکھیں۔ 1965ء کی جنگ کے بعد احمد ندیم قاسمی کے علاوہ دوسرے ترقی پسند شعراء کے ہاں بھی نعت گوئی کی طرف رجحان نمایاں ہونا شروع ہو گیا۔ ان ترقی پسند شعراء کے پسندیدہ موضوعاتِ نعت معاشرتی مساوات اور عدل و انصاف ہیں۔ ان شعرا میں عارف عبدالمتین‘ قتیل شفائی‘ ظہور نظر اور احمد فراز کے

نام لیے جاسکتے ہیں۔ عارف عبدالمتین نے آزاد نظم کی صنف میں نعت کے عمدہ نمونے تخلیق کیے۔ ان کی نعتوں میں جدید غزل کے اثرات واضح طور پر محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ حافظ مظہر الدین کا نعتیہ کلام عصر حاضر کی نعت میں جس روایت کا نمائندہ ہے اس کا تعلق حضور اکرمؐ سے سچی وابستگی سے ہے۔ مظہر کی زباں شیریں وشگفتہ ہے‘ انتخاب و استعمال الفاظ میں وہ صنف نعت کی فنی نزاکتوں کا پورا پورا لحاظ رکھتے ہیں۔ حافظ لدھیانوی ان نعت گو شعرا میں منفرد حیثیت کے حامل ہیں جنھوں نے کامیاب اور پختہ غزل گوئی کے بعد نعت رسولؐ کی طرف رجوع کیا اُن کی نعت حسن تغزل اور کیف نعت کا دل پذیر امتزاج ہے۔

حفیظ تائب کی نعت ذوقِ جدید کی نمائندہ ہے۔ طرزِ احساس اور پیرایۂ اظہار کے لحاظ سے بھی وہ نئے شعراء کے زیادہ قریب ہیں۔ تائب نے اپنی لکھی نعتوں میں حضور اکرمؐ کے ارشادات‘ پیغامات اور مقصد نبوت و بعثتِ نبوی کو ہمیشہ پیش نظر رکھا۔ تائب کی لکھی نعتیں ملکی اور ملی احساسات سے مملو ہیں۔ ان کا اسلوب سہل اور آسان ہے۔ راسخ عرفانی کی نعتیں ان کی قلبی واردات کی مظہر ہیں۔ ان کی نعتوں میں آنحضورؐ کے اُسوہ حسنہ کے بیان کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ یوسف ظفر کی وہ نعتیں جو اُنھوں نے سفر حج کے بعد لکھیں کیف سے لبریز ہیں۔ ان میں سرشاری‘ حاضری اور حضوری کا رنگ نمایاں ہے۔ شورش کاشمیری کی نعت میں ردِ قادیانیت اور عصری مسائل و واقعات کے حوالے ملتے ہیں۔ احسان دانش کی نعت گوئی کا بھرپور اظہار ان کی طویل نعت ’’دارین‘‘ میں ہوا ہے جو مسدس کی ہیئت میں ہے۔

اعظم چشتی‘ محمد علی ظہوری اور مظفر وارثی بیک وقت بہت اچھے نعت گو اور نعت خواں تھے۔ ان کی ذات میں دونوں اوصاف کا امتزاج ایک امتیازی اور اختصاصی بات ہے۔ مظفر وارثی نے اُردو نعت کو ایک مترنم اسلوب دیا۔ ان کی نعت گوئی کا غالب اظہار پیرایۂ غزل ہی میں ہوا ہے مگر انھوں نے قطعہ بند نظموں کی صورت میں بھی نعتیں لکھی ہیں۔

جدید طرزِ اظہار نے عاصی کرنالی کی نعتوں کو دل آویز بنا دیا ہے۔ ان کی نعت کا اسلوب اصلاحی و مقصدی ہے۔ صوفی محمد افضل فقیر کی نعت گوئی اُن کی حب رسولؐ میں سرشاری و شیفتگی کا رنگ لیے ہوئے ہے۔ ان سطور میں نعت کے ایک اور اہم شاعر کا تذکرہ بھی ناگزیر ہے۔ ’’کرم بالائے کرم‘‘ بہزاد لکھنوی کا نعتیہ شعری مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ ان کے سفر حج و زیارات کے بعد کا ہے۔ کیا خوب نعتیہ مجموعہ ہے۔ بہزاد ان شاعروں میں سے ہے جنھوں نے اپنی آواز کے اتصال اور لے کاری سے نعت گوئی کو فروغ دیا۔ مترنم اور چھوٹی بحروں میں ان کا کلام بہت مقبول ہوا۔ ماہر القادری کی نعت گوئی میں ان کی شخصیت کا تحریکی عنصر نمایاں ہے۔ انھوں نے اپنی نعت گوئی کو لادینیت اور ملحدانہ افکار و نظریات کی نفی کے لیے استعمال کیا۔

نعیم صدیقی اور آسی ضیائی دونوں تحریکِ اسلامی سے وابستہ رہے۔ چنانچہ اُن کی نعت گوئی پر تحریکی اور انقلابی پہلو غالب رہا۔ ان دونوں شعرا کے طرزِ اظہار اور اسلوب کے فرق کے باوجود موضوعاتِ نعت ایک جیسے ہیں۔ بشیر

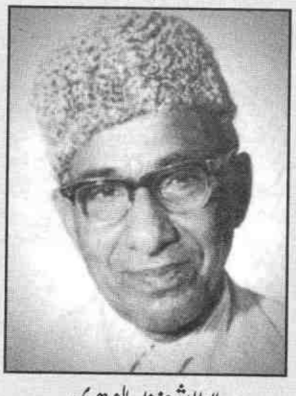
ابوالاثر حفیظ جالندھری

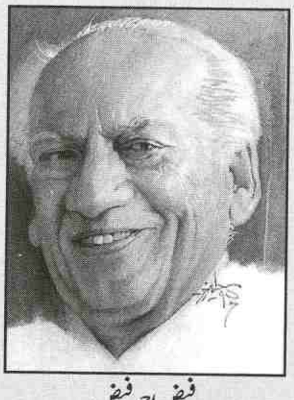
فیض احمد فیض

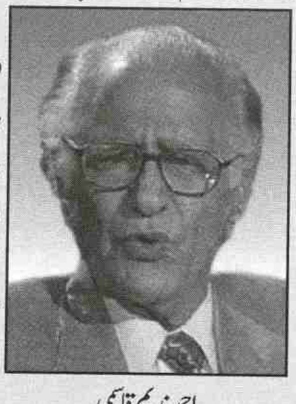
احمد ندیم قاسمی

حسین ناظم‘ سید شریف الدین نیر سہروردی‘ سلیم کوثر‘ افتخار عارف‘ منور ہاشمی‘ ریاض حسین چودھری‘ محمد فیروز شاہ‘ سید صبیح رحمانی‘ واجد امیر اور عمران نقوی‘ سرور حسین نقشبندی کی لکھی نعتیں اس صنف کے لیے افتخار کا باعث بنیں۔

نعت گو شاعرات میں رابعہ نہاں‘ ادا جعفری‘ وحیدہ نسیم‘ پروین فنا سید اور نورین طلعت عروبہ کے ناموں کا حوالہ بہت ضروری ہے۔

نعت گو شاعروں نے دورِ حاضر میں نعت کے ضمن میں بہت سے ہیئتی تجربات بھی کیے ہیں۔ ہائیکو‘ دوہا‘ ماہیا‘ آزاد نظم‘ نظم معریٰ اور نثری نظم کی ہیئت میں بھی نعتیں لکھی جارہی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ غیر منقوط نعتیں‘ نعتیہ قطعات اور رباعیات بھی لکھی جارہی ہیں۔ پاکستانی نعت گو شعرانے نعت کو غزل کے قریب لانے کی شعوری کوشش کی ہے۔ اپنے نظریاتی تشخص کے تناظر میں پاکستان کی سرزمین صنف نعت کے فروغ کے لیے نہایت سازگار ہے۔ چنانچہ پاکستان میں نعت کا فن مسلسل فروغ پذیر ہے۔

غزل

غزل میں زندگی کی سی وسعت ہے۔ جس طرح زندگی اپنے اندر تمام موسم‘ رنگ‘ واقعات‘ جذبے‘ تحریکیں‘ رویے اور رجحان رکھنے پر قادر ہے اسی طرح زندگی ان سب عناصر کو اپنے اندر جذب کرلیتی ہے جس طرح زندگی کا ارتقائی سفر جاری ہے اسی طرح غزل کا ارتقائی سفر بھی ایک تسلسل کے ساتھ جاری ہے۔ ہماری انفرادی اور قومی زندگی کے بدلتے ہوئے مناظر اور مظاہر صنف غزل کا حصہ بنتے جارہے ہیں۔ غزل کے دو مصرعے نہ صرف قاموسِ تخیل کو جذب کرلیتے ہیں بلکہ ذات سے لے کر کائنات تک‘ انفس سے لے کر آفاق تک‘ انسانی احساسات سے لے کر تاثرات تک‘ عمیق کیفیات سے لے کر فلسفیانہ تفکرات تک تمام زاویوں کو اپنے اندر سمیٹ لیتے ہیں۔

قیامِ پاکستان کے فوری بعد ادبی اُفق پر نمایاں ہونے والے غزل گو شعرا کے نام برصغیر کی تقسیم سے قبل ہی ادبی دنیا میں اپنی شناخت متعین کراچکے تھے۔ ان شعرا میں ایم ڈی تاثیر‘ حفیظ جالندھری‘ حفیظ ہوشیارپوری‘ احسان دانش‘ سید عابد علی عابد‘ سیف الدین سیف‘ ظہیر کاشمیری‘ احمد ندیم قاسمی‘ فیض احمد فیض‘ انجم رومانی‘ باقی صدیقی‘ مختار صدیقی‘ عبدالحمید عدم‘ عارف عبدالمتین‘ یوسف ظفر‘ قتیل شفائی‘ ساقی فاروقی‘ شہرت بخاری‘ سراج الدین ظفر‘ ضیاء جالندھری‘ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم‘ بلکہ معروف نظم گو شعرا میراجی اور مجید امجد کے نام بھی شامل کرسکتے ہیں۔ ان شعرا میں ہی سے چند سخن وروں کا رنگ سخن ملاحظہ فرمایئے۔

حفیظ جالندھری

اب تو کچھ اور بھی اندھیرا ہے
یہ مری رات کا سویرا ہے؟

....

دیکھا جو کھا کے تیر کمیں گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہوگئی

....

کیا پابندِ نے نالے کو میں نے
یہ طرزِ خاص ہے ایجاد میری

حفیظ ہوشیار پوری

محبت کرنے والے کم نہ ہوں گے
تری محفل میں لیکن ہم نہ ہوں گے
دلوں کی اُلجھنیں بڑھتی رہیں گی
اگر کچھ مشورے باہم نہ ہوں گے
اگر تو اتفاقاً مل بھی جائے
تری فرقت کے صدمے کم نہ ہوں گے

احمد ندیم قاسمی

انداز ہو بہو تری آواز پا کا تھا
دیکھا نکل کے گھر سے تو جھونکا ہوا کا تھا
کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا
میں تو دریا ہوں، سمندر میں اُتر جاؤں گا
جب ترا حکم ملا، ترک محبت کر دی
دل مگر اس پہ وہ دھڑکا کہ قیامت کر دی
یاد آئے ترے پیکر کے خطوط
اپنی کوتاہیِ فن یاد آئی
عمر بھر سنگ زنی کرتے رہے اہل وطن
یہ الگ بات کہ دفنائیں گے اعزاز کے ساتھ

فیض احمد فیض

ہم نے جو طرزِ فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
فیض گلشن میں وہی طرز بیاں ٹھہری ہے
وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات اُن کو بہت ناگوار گزری ہے

....

جس دھج سے کوئی مقتل کو گیا وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے اس جاں کی تو کوئی بات نہیں

....

باقی صدیقی

آپ کو کارواں سے کیا مطلب؟
آپ تو میرِ کارواں ٹھہرے

....

کشتیاں ٹوٹ گئیں ہیں ساری
اب لیے پھرتا ہے دریا ہم کو

مختار صدیقی

بستیاں، کیسے نہ ممنون ہوں دیوانوں کی
وسعتیں ان میں وہی لائے ہیں ویرانوں کی

وہ بنا ساز بھی ہوتے ہیں گلستانوں کے
خاک جو چھانتے پھرتے ہیں بیابانوں کی

سید عبدالحمید عدم

میں میکدے کی راہ سے ہوکر نکل گیا
ورنہ سفر حیات کا کتنا طویل تھا!

....

ہم کوشاہوں سے عدالت کی توقع تو نہیں
آپ کہتے ہیں تو زنجیر ہلا دیتے ہیں

....

کہتے ہیں عمرِ رفتہ کبھی لوٹتی نہیں
جا میکدے سے میری جوانی اٹھا کے لا

....

ناصر کاظمی

اُنھیں صدیوں نہ بھولے گا زمانہ
یہاں جو حادثے کل ہوگئے ہیں

....

پرانی صحبتیں یاد آرہی ہیں
چراغوں کا دھواں دیکھا نہ جائے
گلی گلی آباد تھی جن سے کہاں گئے وہ لوگ
دلی اب کے ایسی اُجڑی گھر گھر پھیلا سوگ

....

اے دوست ہم نے ترکِ محبت کے باوجود
محسوس کی ہے تیری ضرورت کبھی کبھی

....

سعادت حسن منٹو

ن م راشد

مجید امجد

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم

سو بار چمن مہکا سو بار بہار آئی
دنیا کی وہی رونق دل کی وہی تنہائی
دیکھے ہیں بہت ہم نے ہنگامے محبت کے
آغاز بھی رسوائی ، انجام بھی رسوائی

قیامِ پاکستان کے بعد غزل کی صنف میں جو نئے نام شعری اُفق پر اُبھرے اُن میں سب سے اہم نام ناصر کاظمی کا ہے۔ ناصر کے ساتھ ساتھ جن دوسرے غزل گوشعرا کے نام سامنے آتے ہیں اُن میں ابن انشاء، عزیز حامد مدنی، احمد مشتاق، رسا چغتائی، سلیم احمد، محب عارفی، محبوب خزاں، شان الحق حقی، منیر نیازی، مصطفیٰ زیدی، اطہر نفیس، احمد فراز، فارغ بخاری، خاطر غزنوی، عطا شاد، ظفر اقبال، شہزاد احمد، محشر بدایونی، جون ایلیا، رضی اختر شوق، وزیر آغا، محسن احسان، شور علیگ وغیرہ شامل ہیں۔ ان غزل گوشعرا کے نام 1947ء سے لے کر تقریباً 1960ء تک کے عرصے کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ ان میں سے چند شعرا کا رنگ غزل پیش کیا جاتا ہے۔

شکستہ پا راہ میں کھڑا ہوں، گئے دنوں کو بلا رہا ہوں
جو قافلہ میرا ہم سفر تھا مثالِ گردِ سفر گیا وہ

....

ابن انشاء

ہم پر یہ سختی کی نظر؟ ہم ہیں فقیر رہگزر
رستہ کبھی روکا ترا؟ دامن کبھی تھاما ترا؟
بے درد! سنی ہو تو چل، کہتا ہے کیا اچھی غزل
عاشق ترا، رسوا ترا، شاعر ترا، انشاء ترا

احمد مشتاق

مل ہی جائے گا کبھی، دل کو یہ یقیں رہتا ہے
وہ اسی شہر کی گلیوں میں کہیں رہتا ہے
دل فسردہ تو ہوا دیکھ کر اُس کو لیکن
عمر بھر کون جواں کون حسیں رہتا ہے

محبوب خزاں

ایک محبت کافی ہے
باقی عمر اضافی ہے

منیر نیازی

میری ساری زندگی کو بے ثمر اُس نے کیا
عمر میری تھی مگر اس کو بسر اُس نے کیا
راہبر میرا بنا گمراہ کرنے کے لیے
مجھ کو سیدھے راستے سے در بدر اُس نے کیا
شہر کو برباد کر کے رکھ دیا اُس نے منیر
شہر پر یہ ظلم میرے نام پر اُس نے کیا

....

منیر اس ملک پر آسیب کا سایہ ہے یا کیا ہے
کہ حرکت تیز تر ہے اور سفر آہستہ آہستہ

....

ترے وصال کی رُت ہے مگر خیال کی دھوپ
سجا رہی ہے تری رہ گزر سرابوں سے

ظفر اقبال

اُس کے ہر طرزِ تغافل پہ نظر رکھتی ہے
آنکھ ہے دل تو نہیں ساری خبر رکھتی ہے

....

کاغذ کے پھول سر پہ سجا کر چلی حیات
نکلی برونِ شہر تو بارش نے آلیا

....

یہاں کسی کو بھی کچھ حسبِ آرزو نہ ملا
کسی کو ہم نہ ملے اور ہم کو تو نہ ملا

میرزا ادیب

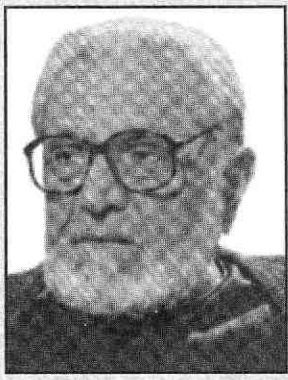
اشفاق احمد

عبداللہ حسین

اس شہر سنگ دل کو جلا دینا چاہیے
پھر اس کی خاک کو بھی اُڑا دینا چاہیے
ملتی نہیں پناہ ہمیں جس زمین پر
اک حشر اُس زمیں پہ اُٹھا دینا چاہیے

احمد فراز

بزمِ مقتل جو سجے کل تو یہ امکان بھی ہے
ہم سے بسمل تو رہیں آپ سا قاتل نہ رہے

....

منصف ہو اگر تم تو کب انصاف کرو گے
مجرم ہیں اگر ہم تو سزا کیوں نہیں دیتے

....

میں تیرا نام نہ لوں پھر بھی لوگ پہچانیں
کہ آپ اپنا تعارف ہوا بہار کی ہے
ہم نہ ہوتے تو کسی اور کے چرچے ہوتے
خلقتِ شہر تو کہنے کو فسانے مانگے

....

پاکستانی غزل کی بلوچستان سے بھرپور نمائندگی عطا شاد نے کی۔ ان کی غزل کے ایک شعر کا مطالعہ کیجیے۔

ظفر اقبال کو اپنی لسانی توڑ پھوڑ کا شعور ہے اور اُس پر ہونے والی تنقید کا بھی احساس ہے چنانچہ کہتے ہیں۔

ظفر! یہ وقت ہی بتلائے گا کہ آخر ہم
بگاڑتے ہیں زباں یا زباں بناتے ہیں

شہزاد احمد

ڈرتا ہوں میرے سر پہ ستارے نہ آ پڑیں
چلتا ہوں آسماں کی طرف دیکھتا ہوا

....

سوا نیزے پہ سورج آ گیا ہے
یہ دن بھی اب بسر کرنا پڑے گا
بہت آتے ہیں پتھر ہر طرف سے
شجر کو بے ثمر کرنا پڑے گا

جون ایلیا

حاصلِ کُن ہے یہ جہانِ خراب
یہی ممکن تھا اتنی عجلت میں
کیا ستم ہے کہ اب تری صورت
غور کرنے پہ یاد آتی ہے

1960ء اور 1970ء کے درمیان پاکستانی غزل کے اُفق پر ظہور کرنے والے غزل گو شعرا میں شکیب جلالی، عبیداللہ علیم، انور شعور، شیر افضل جعفری، ناصر شہزاد، ریاض مجید، عدیم ہاشمی، اقبال ساجد، مرتضیٰ برلاس، ظہور نظر اور افتخار عارف وغیرہ شامل ہیں۔

شکیب جلالی

آ کر گرا تھا کوئی پرندہ لہو میں تر
تصویر اپنی چھوڑ گیا ہے چٹان پر
سوچو تو سلوٹوں سے بھری ہے تمام روح
دیکھو تو اک شکن بھی نہیں ہے لباس میں
آ کے پتھر تو مرے صحن میں دو چار گرے
جتنے اُس پیڑ کے پھل تھے پسِ دیوار گرے

عبیداللہ علیم

ہوا کے دوش پہ رکھے ہوئے چراغ ہیں ہم
جو بجھ گئے تو ہوا سے شکایتیں کیسی

انور شعور

یہ جانتے ہوئے بھی گزاری ہے زندگی
ہم زندگی کے ہیں نہ ہماری ہے زندگی

عدم ہاشمی

کہا ساتھی کوئی دُکھ درد کا تیار کرنا ہے
جواب آیا کہ یہ دریا اکیلے پار کرنا ہے
کہا مجھ کو بنایا ہے تو پھر یہ دوسرے کیوں ہیں
جواب آیا کہ تجھ کو دوسروں سے پیار کرنا ہے

اقبال ساجد

سوچا تھا اُس نے رات کی چپ میں مجھے ملے
لیکن ہوا نے راہ میں پتے گرا دیے

....

افتخار عارف

بلند ہاتھوں میں زنجیر ڈال دیتے ہیں
عجیب رسم چلی ہے دعا نہ مانگے کوئی

....

ہم جہاں ہیں وہاں ان دنوں عشق کا سلسلہ مختلف ہے
کاروبارِ جنوں عام تو ہے مگر اک ذرا مختلف ہے

....

دمشقِ مصلحت و کوفۂ نفاق کے بیچ
فغانِ قافلۂ بے نوا کی قیمت کیا

1965ء کی پاک بھارت جنگ نے غزل پر نہیں مگر نظم پر ضرور اثرات ڈالے ہیں۔ اس لیے اس کا ذکر نظم کے حوالے سے آئے گا۔

1971ء ہماری قومی زندگی کا اہم موڑ ہے۔ 16 دسمبر 1971ء کو پاکستان دو حصوں میں تقسیم ہوگیا۔ اس قومی سانحے نے پاکستانی غزل پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ ناصر کاظمی کی غزل سے لے کر جدید غزل گو شعرا تک اس سانحے کے اثرات محسوس کیے جاسکتے ہیں۔

سقوطِ ڈھاکہ کے حوالے سے چند شعرا کے شعر دیکھئے جن میں پاکستان کی تاریخ کا ایک اہم دور سمٹ آیا ہے۔

عمارتیں تو جل کے راکھ ہوگئیں
عمارتیں بنانے والے کیا ہوئے
(ناصر کاظمی)

ہم کہ ٹھہرے اجنبی اتنی مداراتوں کے بعد
پھر بنیں گے آشنا کتنی ملاقاتوں کے بعد
کب نظر میں آئے گی بے داغ سبزے کی بہار
خون کے دھبے دُھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد
(فیض)

دیوار کیا گری مرے خستہ مکان کی
لوگوں نے میرے صحن میں رستے بنالیے
(سبطِ علی صبا)

اُس دن ایسی سرخی تھی اخباروں میں
گونگے ہوگئے شہر کے سارے ہاکر بھی
(جلیل عالی)

اسلم انصاری، خورشید رضوی اور غلام محمد قاصر اگرچہ ستر کی دہائی سے بہت پہلے مطلعِ سخن پر نمودار ہوئے اور اپنے کلام کی نفاست اور لہجے کی ندرت کے باعث مقبول ٹھہرے مگر اُن کا اسلوبِ خاص جو اُن کی شناخت کا وسیلہ بنا، ستر کی دہائی میں اپنی تکمیلی صورت میں ظاہر ہوا۔ صابر ظفر جدید تر غزل گوؤں میں اپنے لہجے کی سادگی، بیان کی رعنائی اور موضوعات کی وسعت کے لحاظ سے الگ پہچانے جاتے ہیں۔ صابر ظفر کی غزل خالصتاً پاکستانی غزل ہے کہ اس میں پاکستان کی بوباس پورے طور پر موجود ہے۔ ہماری تمام علاقائی زبانوں کے لہجے اور لفظ اس میں فطری طور پر شامل ہوتے چلے گئے ہیں۔

حسین سحر جدید تر عہد کا وہ سحر کار شاعر ہے جس کی تلمیحات نے شعر کی تہہ داری اور رمزیت میں اضافہ کیا ہے۔ ثروت حسین کے انوکھے طرزِ اظہار نے اُن کے اسلوب کو انفرادیت کا وہ ذائقہ عطا کیا جس پر کسی دوسرے غزل گو شاعر کے رنگِ سخن کی چھاپ دکھائی نہیں دیتی۔ علی اکبر عباس نے جدید تر پاکستانی غزل کو نئی شعریات کے ذائقے سے سرشار کیا ہے۔ ان کی تخلیقی شناخت ان کے منفرد شعری کارنامے ''رچنا'' کی مرہونِ منت ہے۔ علی اکبر عباس نے پنجابی زبان سے استفادہ کرکے اپنے لیے نئی شعری زبان وضع کی ہے۔ ''رچنا'' میں شامل غزلیات

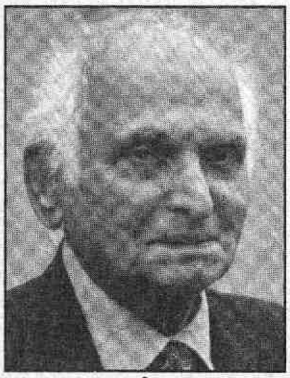
انتظار حسین

ابن انشاء

ڈاکٹر وزیر آغا

پاکستانی غزل کا نیا چہرہ متعارف کراتی ہیں۔

محمد اظہار الحق اور خالد اقبال یاسر کی غزل اپنی مخصوص لفظیات اور تراکیب کی وجہ سے ایک ساتھ پڑھے جانے کے لائق ہے۔ اظہار کی شاعری میں اسلامی تہذیب و تمدن کے روشن زمانے اپنے تمام تر جاہ و جلال کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ مسلم تہذیب کی ثروتوں کے اظہار کے لیے انھوں نے فقر و درویشی، سلطنت و شاہی کے عناصر اور علامتیں استعمال کرکے غزل کے دائرہ لفظیات کو کشادگی عطا کی ہے۔ پاکستانی غزل کی تاریخ میں محمد اظہار الحق اپنی مثال آپ ہیں۔ اُن کی غزل میں مخصوص داستانوی فضا ملتی ہے۔ خالد اقبال یاسر نے لفظیات کی تشکیل میں دربار اور رزم گاہ کے متعلقات اور داستانوی عناصر سے اکتساب کیا ہے۔

یہاں غزل کے ایک اور اہم شاعر کا ذکر بھی ناگزیر ہے۔ یہ منفرد شاعر سلیم کوثر ہیں۔ ان کی غزل غنائیت کے ذائقے سے معمور ہے۔ انھوں نے الفاظ کے دروبست، قوافی اور ردیف کے چناؤ اور اوزان و بحور کے انتخاب میں موسیقیت کے تقاضوں کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ خالد اقبال یاسر کی طرح جمال احسانی کی غزل میں داستانوی عناصر کے عمل دخل نے اس کی رمزیت کے رنگ کو گہرائی عطا کی ہے۔

اسی اور نوے کی دہائیوں میں جدید تر غزل کے قافلے میں ایسے غزل گو شعرا شامل ہوئے جنھوں نے اپنے منفرد اندازِ سخن سے غزل کی تب و تاب میں اضافہ کیا ان تازہ کار شعرا میں ڈاکٹر اختر شمار، عباس تابش، قمر رضا شہزاد، اختر عثمان، محسن چنگیزی، سعود عثمانی، شناور اسحاق، شہاب صفدر، ارشد نعیم اور شاہین عباس کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان شعرا کے ہاں زبان و بیان کا سلیقہ پاکستانی غزل کے شاندار مستقبل کی ضمانت ہے۔

جہاں تک پاکستانی غزل گو شاعرات کا تعلق ہے ادا جعفری سے لے کر آج کی تمام تازہ کار شاعرات تک غزل گوئی کا ایک ایسا روشن سلسلہ ہے۔ جسے ادب کا کوئی طالب علم نظر انداز نہیں کرسکتا۔ زہرہ نگاہ ہوں یا عرفانہ عزیز، کشور ناہید ہوں یا پروین شاکر، شبنم شکیل ہوں یا شاہدہ حسن، نورین طلعت عروبہ ہوں یا یاسمین حمید، ان تمام قابلِ احترام شاعرات کی غزل جدید اور عصری حسیت کے اظہار اور ہم عصر زندگی کے متنوع تجربات کے بیان سے مالا مال ہے یہ شاعرات پاکستانی غزل کی دھنک کے تمام رنگوں کی بھرپور نمائندگی کرتی ہیں۔ اس دھنک کے تمام رنگ غزل کی تہہ داری، پُرکاری اور ہمہ جہتی کے عکاس ہیں۔

نظم

ہر دور میں اور ہر عہد میں نظم موضوع اور اظہار دونوں سطحوں پر اپنا پیرہن بدلتی رہی ہے اور یہ بات مطالعے میں آئی کہ نظم روایتی فارم اور فریم توڑتے ہوئے بڑی سرعت سے نئے آفاق اور نئی جہات کی طرف سرگرم سفر رہی ہے۔

قیامِ پاکستان سے لے کر 1988ء تک نظم گوئی کی تین تحریکیں ترقی پسند تحریک، حلقہ اربابِ ذوق کی تحریک اور لسانی تشکیلات کی تحریک پاکستانی ادب کی شناخت بنی رہی ہیں۔ ہمارے وہ نظم نگار جو 1947ء سے پہلے اپنی تمام تر تخلیقی توانائیاں بروئے کار لاچکے تھے ان میں حفیظ جالندھری، مولانا ظفر علی خاں، جوش ملیح آبادی اور احسان دانش کے نام نمایاں ہیں۔ اس دور میں نظم میں ہیئتوں کا کوئی غیر معمولی تجربہ دکھائی نہیں دیتا البتہ وہ نئی ہیئتیں جو پہلے سے متعارف ہوچکی تھیں مثلاً آزاد نظم اور نظم معریٰ، ان دونوں ہیئتوں میں مزید وسعت پیدا ہوئی۔ حفیظ جالندھری کا ایک

مجموعہ کلام قیامِ پاکستان کے بعد چھپا۔ جوش جو پہلے ہندوستان میں مقیم تھے، جب پاکستان آئے تو ان کے چند مجموعہ ہائے کلام اشاعت پذیر ہوئے جن میں کوئی جدت یا نُدرت نہیں تھی۔ اسی طرح قیامِ پاکستان کے بعد احسان دانش بھی اپنے گزشتہ تخلیقی کام کی تکرار کرتے رہے۔ اسی دور کے وہ نظم نگار جنہیں ہم بجا طور پر جدید نظم نگاری کا نقیب قرار دے سکتے ہیں ان میں ن۔م۔راشد، فیض احمد فیض، قیوم نظر، مجید امجد، یوسف ظفر، احمد ندیم قاسمی، جعفر طاہر، مختار صدیقی، ظہیر کاشمیری، وزیر آغا، ظہور نظر، ضیاء جالندھری، منیر نیازی، ابن انشاء، عرش صدیقی، عزیز حامد مدنی وغیرہ شامل ہیں۔

فیض، ظہیر کاشمیری اور احمد ندیم قاسمی نے نظم کو اپنے ترقی پسندانہ خیالات کے ابلاغ کا ذریعہ بنایا کیونکہ ان کا خطیبانہ بلند آہنگ اور پرجوش اسلوب صرف اسی صنفِ کے سانچے میں ڈھل سکتا تھا۔ فیض نے اپنی نظموں میں رمزیت اور ایمائیت کا اسلوب اپنایا۔ احمد ندیم قاسمی کے موضوعات

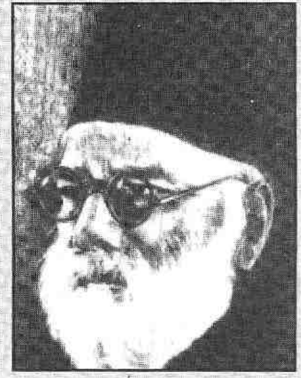

مولوی عبدالحق

ڈاکٹر سید عبداللہ

سید ضمیر جعفری

فیض کی نسبت زیادہ وسیع اور متنوع ہیں۔ وہ احترامِ انسانیت اور تکریمِ آدمیت کے شاعر ہیں۔ ظہیر کاشمیری کا بلند آہنگ لب ولہجہ کہیں کہیں شعریت کے تقاضوں کو مجروح کرتا دکھائی دیتا ہے۔

ن۔م۔راشد نے مغربی شعرا کے واضح اثرات قبول کیے اور آزاد نظم کے سانچوں کو انتہائی مہارت سے برتا۔ قیوم نظر، یوسف ظفر اور مختار صدیقی کا تعلق حلقہ اربابِ ذوق کی تحریک سے تھا۔ اس تحریک سے وابستہ شعراء نے خالصتاً تخلیقی ادب کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔ مجید امجد کی اپنی ذات ایک تحریک کی حیثیت رکھتی تھی۔

ڈاکٹر وزیر آغا ایک معتبر نقاد، انشائیہ نگار، نظم نگار اور غزل گو شاعر تھے۔ انھوں نے اپنی نظموں میں نئے استعارے اور علامتیں استعمال کی ہیں۔ اجتماعی شعور اور لاشعور کے امتزاج سے جذبے کی بوقلموں جہتوں کو اُجاگر کیا ہے۔ ان کی نظموں میں زندگی اور فطرت کے مناظر کثرت سے استعمال ہوئے ہیں۔ ان کی دھرتی کی محبت سے گندھی بیشتر نظمیں ایسی ہیں جن میں زمین سانس لیتی محسوس ہوتی ہے۔

سید جعفر طاہر کی زیادہ تر نظمیں ڈرامائی اسلوب میں لکھی گئی ہیں۔ ضیاء جالندھری کی نظموں میں صوتی آہنگ کی تاثیر کا احساس نمایاں ہے۔ منیر نیازی پاکستانی نظم کے بہت اہم شاعر ہیں۔ وہ ابتدا میں مجید امجد کے زیر اثر تھے مگر بعد ازاں انھوں نے اپنا لب ولہجہ دریافت کر لیا۔ عزیز حامد مدنی کی آزاد نظموں میں جذبے کی برہمی اور احساس کے اضطرار کی کیفیات نمایاں ہیں۔ ان کی شاعری جدید ذہن کی عکاس ہے اور اس میں اُن کے وسیع مطالعے کو بڑا دخل ہے۔ اُن کی نظموں میں جدید دور کی میکانکی زندگی، صنعتی ماحول اور سائنسی تباہ کاریوں کے خلاف شدید ردعمل پایا جاتا ہے۔ پاکستانی نظم کے اس پہلے دور کے دوسرے قابل ذکر شعرا میں فارغ بخاری، محبّ عارفی، جمیل ملک، عارف عبدالمتین، ساقی فاروقی، قتیل شفائی، اعجاز فاروقی اور احمد فراز کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ پاکستانی نظم کے ابتدائی دور کے شاعروں میں سلیم احمد، عبدالعزیز خالد، حمایت علی شاعر، احسان اکبر، فہیم اعظمی، جمیل الدین عالی، آفتاب اقبال شمیم اور احمد شمیم کا ذکر ہر حوالے سے ناگزیر ہے۔

1958ء سے پاکستانی نظم کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے کہ جہاں سے ہماری نظم نے ایک نئی کروٹ لی۔ اس دور میں پاکستانی نظم میں حقیقت پسندی کی روایت کے ساتھ ساتھ جدیدیت کی رو کا بھی آغاز ہوا۔ ان شعرا پر جدیدیت اور وجودیت کے اثرات نمایاں تھے۔ اپنے ماحول سے ناآسودگی، بیزاری، بغاوت، فرار اور پرانے تہذیبی نظام کو قبول کرنے سے انکار ان کی نظمیہ شاعری کی مشترک خصوصیات تھیں۔ ان شعرا میں افتخار جالب، جیلانی کامران، انیس ناگی، عباس اطہر، احمد ہمیش، زاہد ڈار، عبدالرشید، سرمد صہبائی، محمد سلیم الرحمٰن، تبسم کاشمیری کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ ان میں سے کچھ شعرا نے لسانی تشکیلات کے نظریے کو فروغ دیا۔

پاکستانی نظم کا تیسرا دور جو گزشتہ دونوں ادوار کی ارتقا یافتہ صورت کا تسلسل ہے اس میں 1965ء کی پاک بھارت جنگ، سقوطِ ڈھاکا، ضیاء الحق کا دورِ حکومت، افغانستان میں روس کی مداخلت جیسے اہم واقعات پیش آئے۔ بالخصوص پاک بھارت جنگ 1965ء سقوطِ ڈھاکہ 1971ء جیسے واقعات پر نظم کے شعراء نے بہت عمدہ تخلیقات پیش کیں۔ اس ضمن میں مجید امجد کی گراں قدر خدمات سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

نظم کی صنف میں ہمارے ہاں بھرپور امکانات کے حامل بہت سے نظم نگار شاعر اور شاعرات موجود ہیں جو یقیناً اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے نظم کے دامن کو بھر رہے ہیں۔ پاکستانی نظم کے قابل مطالعہ شعرا اور شاعرات میں تاج سعید، امجد اسلام امجد، اسلم انصاری، قائم نقوی، انوار فطرت، جاوید انور، سلیم کوثر، اقبال کوثر، ممتاز اطہر، خاور اعجاز، اقتدار جاوید، محسن بھوپالی، نصیر احمد ناصر، خالد احمد، اختر حسین جعفری، رفیق سندیلوی، علی محمد فرشی، محمد افسر ساجد، امداد آکاش، فرخ یار، اعجاز رضوی، معین نظامی، زاہد منیر عامر، اختر عثمان، عدنان بیگ، ابوذر، سید مبارک شاہ اور وحید احمد کے نام شامل کیے جاسکتے ہیں۔ یہاں امجد اسلام امجد کی نظم کا خصوصی حوالہ ناگزیر ہے۔ امجد کی نظم میں جذبے کی نزاکت اور احساس کی لطافت کے حوالے سے مواد، موضوع اور ہیئت کی Perfection موجود ہے، ان کی ہر نظم بہت متاثر کن ہے۔ پاکستانی نظم کی ممتاز اور مستند شاعرات میں ادا جعفری، زہرہ نگاہ، پروین فنا سید، فہمیدہ ریاض، کشور ناہید، سیدہ حنا، شاہین مفتی، پروین شاکر، منصورہ احمد، ماہ طلعت زاہدی، شبنم شکیل، ثمینہ راجہ، بلقیس محمود (سیفی) شاہدہ حسن، سیما شکیب، عشرت آفریں، فاطمہ حسن، نوشی گیلانی، گلنار آفریں، یاسمین گل، ناہید قمر اور نجیبہ عارف کو کسی صورت میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

1972ء کے بعد سے پاکستانی شاعری میں نثری نظم کا چلن بھی عام ہوا ہے۔ اس صنف میں لکھنے والوں میں مبارک احمد، قمر جمیل، رئیس فروغ، جاوید شاہین، محمد اظہار الحق، افضال احمد سید، ثروت حسین، عبدالرشید، فہیم جوزی، سلیم آغا قزلباش اور جواز جعفری کا نام اور کام اہمیت کا حامل ہے۔ نثری نظم کی شاعرات میں کشور ناہید، شائستہ حبیب، پروین

شاکر، نسرین انجم بھٹی، سارا شگفتہ، عذرا عباس، شاہدہ حسن، فاطمہ حسن، ماہ طلعت زاہدی وغیرہ کے نام نمایاں ہیں۔

پاکستانی نظم کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ہماری نظم شکل و صورت، زبان اور اندازِ بیان، موضوع اور مواد کی بہت سی تبدیلیوں سے آشنا ہوئی ہے اور اس نے غزل کی نسبت عالمی ادبی تحریکوں کے زیادہ اثرات قبول کیے ہیں۔ یہ نظم سیاسی بیداری، سماجی شعور اور تخلیقی وفور کی عکاس ہے۔

متفرق اصناف شعر

متفرق اصناف شعر میں دوہا نگاری، ہائیکو، ماہیا اور نظمانہ پاکستانی ادب کی قابل توجہ جہات ہیں۔ پاکستانی شعری ادب کی تفہیم کے لیے ان اصناف کا مطالعہ یقیناً بہت ضروری ہے۔

دوھا

قابلِ ذکر دوہا نگاروں میں خواجہ دل محمد، جمیل الدین عالی، الیاس عشقی، پرتو روہیلہ، عرش صدیقی، تاج سعید، عبدالعزیز خالد، قتیل شفائی، الطاف پرواز، ناصر شہزاد، حامد برگی، صابر آفاقی، ڈاکٹر وحید قریشی، عمر فیضی، جمال پانی پتی، نصیر احمد ناصر، بشیر سیفی، بشریٰ رحمٰن اور مشتاق عاجز وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ تاہم اس وقت ڈاکٹر طاہر سعید ہارون پاکستان کے سب سے اہم دوہا نگار ہیں۔ اب تک اُن کے 14 مجموعے چھپ چکے ہیں۔

ھائیکو

پاکستان میں اس جاپانی صنف سخن کے بنیاد گزار ڈاکٹر محمد امین ہیں۔ اس صنف سخن کو اعتبار بخشنے والے دوسرے ممتاز ہائیکو نگاروں میں سحر انصاری، بشیر سیفی، ڈاکٹر پرویز پروازی، رسا چغتائی، علی محمد فرشی، راغب مراد آبادی، محسن بھوپالی، سلیم کوثر، نسیم سحر، شاہدہ حسن، ڈاکٹر اختر شمار، ارشد نعیم، ممتاز اطہر، خاور اعجاز، اصغر عابد، عباس تابش اور انوار فطرت وغیرہ شامل ہیں۔

ماھیا

پنجابی ادب کی یہ ہر دل عزیز صنف اُردو میں بھی مقبول ہوتی جارہی ہے۔ اُردو میں پہلے پہل اختر شیرانی اور چراغ حسن حسرت نے ماہیے کہے۔ پھر کچھ دیگر اُردو شاعروں نے بھی اس طرف توجہ کی جن میں علی محمد فرشی، احمد حسین مجاہد، امین خیال، حیدر قریشی، سجاد مرزا، سعید شباب، افتخار شفیع اور نثار ترابی کو بہت پسند کیا گیا۔

نظمانہ

جدید پاکستانی صنف نظم ہے۔ یہ وہ صنف نظم ہے جس میں کسی کہانی یا مختصر افسانے کو نظم کیا جاتا ہے۔ نظمانے'' میں اختصار اور جامعیت کی شان موجود ہے۔ نظمانہ، افسانے کی منظوم شکل ہے۔ محسن بھوپالی اس صنف نظم کے بانی تھے۔

ناول

قیامِ پاکستان سے قبل عزیز احمد، احسن فاروقی، قرۃ العین حیدر ناول لکھ رہے تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد اُنہوں نے لکھنا جاری رکھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد سب سے قابل توجہ ناول عزیز احمد نے لکھے۔ یہ ناول ہیں ''ایسی بلندی ایسی پستی''، گریز اور شبنم''۔ ان کا ناول ''ایسی بلندی ایسی پستی'' ان کا شاہکار ناول ہے۔ عزیز احمد ایک باشعور ناول نگار تھے۔ نفسیاتی حقیقت نگاری کے حوالے سے وہ اُردو ناول میں ممتاز مقام کے حامل ہیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد لکھے جانے والے ناول کا ایک بڑا رجحان ہجرت اور فسادات کا موضوع ہے۔ اس نوعیت کے ناولوں میں رئیس احمد جعفری کا ''مجاہد''، نسیم حجازی کا ''خاک و خون''، ایم اسلم کا ''رقص ابلیس'' اور قدرت اللہ شہاب کا ناولٹ ''یا خدا'' شامل ہیں۔

1950ء سے اب تک ناولوں کے اُفق پر ہمارے ہاں جو سب سے بڑی ناول نگار شخصیت سامنے آئی ہیں وہ قرۃ العین حیدر ہیں۔ ابتدائی تین دہائیوں تک بہت سے ناول براہِ راست قرۃ العین حیدر کے زیر اثر اور کئی ناول اس فکری رجحان کی تردید یا ردِ عمل میں لکھے گئے۔ قرۃ العین حیدر کا سب سے بڑا کمال مسلسل ہمہ جہتی وحدت نمو ہے جو ان کی پہلی تحریر سے لے کر وفات تک لکھی جانے والی آخری تحریر تک برقرار رہی۔

1959ء میں ان کا ناول ''آگ کا دریا'' شائع ہوا یہ اُردو ادب میں پہلا بڑا تخلیقی تجربہ ہے۔ ''آگ کا دریا'' بڑے کینوس کا ناول ہے جو گزشتہ چار ہزار سال کی تہذیبی، سیاسی، تاریخی اور معاشرتی زندگی کی عہد بہ عہد ابھرنے والی علامات سے گزرتا ہوا عہد جدید تک آتا ہے۔

احسن فاروقی کا سب سے پہلا ناول ''شامِ اودھ'' 1948ء میں چھپا۔ ناول نگاری پر جس قدر عبور احسن فاروقی کو حاصل تھا، برصغیر میں شاید ہی کسی کو حاصل رہا ہو۔ ان کا اصل کارنامہ ناول ''سنگم'' ہے۔ اس ناول میں اُنہوں نے برصغیر کی تاریخ کو علامتی انداز میں بیان کیا ہے۔ احسن فاروقی کے بعد پاکستان کے ناول نگاروں میں ایک اور اہم نام شوکت صدیقی کا ہے۔ اُن کا پہلا ناول ''خدا کی بستی'' ہے جس میں تقسیم برصغیر کے بعد تشکیل پذیر شہری معاشرے کے باطنی حقائق کو جرأت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ان کا دوسرا ناول ''جانگلوس'' ہے۔ جو تین جلدوں پر مشتمل ہے یہ خالصتاً پاکستانی معاشرت کا ترجمان ناول ہے۔ اس ناول میں پاکستان کا مکمل تاریخی تہذیبی سماجی اور جغرافیائی لینڈ اسکیپ پیش کیا گیا ہے۔ اسے ہم خالصتاً پاکستانی ادب کا نمائندہ ناول قرار دے سکتے ہیں۔

جسٹس (ر) ڈاکٹر جاوید اقبال

ڈاکٹر جمیل جالبی

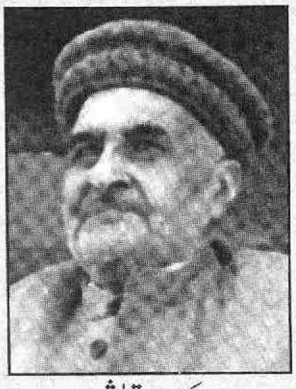

ڈاکٹر وحید قریشی

خدیجہ مستور کا ناول ''آنگن'' ایسا ناول ہے جسے قارئین ادب کی طرف سے بڑی پذیرائی ملی اور ناول کے نقادوں نے بھی اس ناول کو دل کھول کر داد دی۔ آنگن کی خوبی کہانی کی بُنت، کردار نگاری اور اختتامیہ ہے۔ بحیثیت مجموعی آنگن پاکستانی ادب کے چند منتخب اور کامیاب ناولوں میں شمار کیے جانے کے لائق ہے۔ ''زمین'' اس ناول کی توسیع ہے۔ جمیلہ ہاشمی کا شاہکار ناول ''دشتِ سوس'' ایک بڑا ادبی کارنامہ ہے۔ اس میں منصور بن حلاج کی زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ناول میں اس دور کے سیاسی، سماجی، مذہبی اور تہذیبی کوائف کو خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔

عبداللہ حسین پاکستان کے اُن ناول نگاروں میں سے ہیں جنھوں نے ''اداس نسلیں'' اور نادار لوگ'' لکھ کر پاکستانی ناول کی تاریخ میں اپنا مقام بنایا۔ دوسرا ناول پہلے

ناول کا تسلسل ہے دوسرا ناول پاکستانی معاشرے کے مزاج پر بھرپور تبصرہ ہے۔ بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو عبداللہ حسین کو پاکستانی ناول کی تاریخ کا ایک عہد قرار دیا جاسکتا ہے۔ انتظار حسین کی تخلیقی واردات کا مرکزی نقطہ ہجرت ہے۔ ان کے دو ناول ''بستی'' اور ''آگے سمندر ہے'' ان کا بھرپور تخلیقی تعارف ہیں۔ ان کے دوسرے دو ناول زیادہ قابل توجہ نہیں ہیں۔ اُن کا ناول ''بستی'' ایک زاویے سے دیکھا جائے تو ان کی آپ بیتی ہے۔ سقوطِ مشرقی پاکستان کے موضوع پر سلمیٰ اعوان کا ناول ''تنہا'' اور طارق محمود کا ''اللہ میگھ دے'' رونگٹے کھڑے کر دینے والی تخلیقات ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ کے ناول ''بہاؤ''، ''راکھ''، ''اے غزالِ شب'' اور ''خس خاشاک زمانے'' ان کے مستند ناول نگار ہونے پر مہر تصدیق ثابت کر چکے ہیں۔ پلاٹ، منظر نگاری، ماحول آفرینی اور کردار نگاری کے حوالے سے یہ چاروں ناول قابل تحسین کاوش ہیں۔ تارڑ سے بھی پہلے بانو قدسیہ کا ذکر آنا چاہیے تھا۔ اس فروگذاشت کے لیے معذرت۔ بانو آپا کا ناول ''راجہ گدھ'' ان کی تخلیقی معراج ہے۔ اس ناول نے پاکستانی ناول کے قرۃ العین حیدر سٹائل سے نکلنے کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ ناول پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ بانو آپا نے اپنے سماجی، معاشرتی اور مذہبی تصورات کو اس ناول میں پوری طرح سمو دیا ہے۔ انھوں نے یہ ناول لکھ کر رزقِ حلال اور رزقِ حرام کے موضوعات کو دوام بخشا ہے۔

رحیم گل کا ناول ''جنت کی تلاش'' ایک غیر معمولی تخلیقی تجربہ ہے جس میں حیات و کائنات کے بنیادی موضوعات زیر بحث لائے گئے ہیں۔ سید شبیر حسین کا ناول ''جھوک سیال'' اور غلام الثقلین نقوی کا ناول ''میرا گاؤں'' پنجاب کے دیہی پس منظر میں لکھے گئے ہیں اور نہایت کامیاب ناول ہیں۔ محمد خالد اختر کا ناول '''' چاکیواڑہ میں وصال''، نشاط فاطمہ کا ناول ''آنسو جو بہہ نہ سکے'' اس صنف کے لیے باعث افتخار ہیں۔

مرزا اطہر بیگ کے تمام ناول سوچنے کی دعوت دیتے ہیں اور نہایت سنجیدہ قارئین ادب کے ناول ہیں۔ مرتکز فلسفیانہ مطالعے کے پس منظر میں لکھے گئے یہ ناول عالمانہ تخلیقی سرگرمی ہیں۔

دورِ حاضر میں قارئین کی نئی نسل کو اپنی جانب متوجہ کرنے والے پاپولر ناول نگاروں میں عمیرہ احمد اور ہاشم ندیم کے نام اہم ہیں۔ عمیرہ احمد کا ناول ''پیر کامل'' اور ہاشم ندیم کا ''عبداللہ'' بالخصوص بہت مقبول ہوئے۔ اپنے اپنے دور میں ابن صفی اور نسیم حجازی بھی ہمارے ہر دلعزیز ناول نگار رہے ہیں۔

افسانہ

قیامِ پاکستان کے بعد کچھ عرصہ تک تو ہمارے افسانے کا غالب موضوع فسادات رہا لیکن کچھ مدت بعد جب افراتفری اور انتشار کا دور ختم ہوا زندگی کے بدلتے معمولات کے ساتھ ساتھ کچھ نئے موضوعات بھی افسانہ نگاروں کی توجہ کا مرکز بنتے گئے۔ اس زمانے میں ایک نمایاں رجحان ماضی پرستی کا تھا۔ ماضی کی یادوں کی بازیافت کے حوالے سے انتظار حسین اور اے حمید جیسے افسانہ نگاروں کا نام سرفہرست ہے۔

پاکستانی افسانے کا پیش منظر مرتب کرنے والے دوسرے اہم افسانہ نگاروں میں اشفاق احمد، شوکت صدیقی، ابراہیم جلیس، غلام الثقلین نقوی، رحمان مذنب، غلام عباس اور شفیق الرحمٰن وغیرہ شامل ہیں۔ آئندہ سطور میں ہم پاکستان کے نامور افسانہ نگاروں کے فن پر اختصار سے تبصرہ کریں گے۔

احمد ندیم قاسمی ایک حقیقت پسند افسانہ نگار ہیں۔ ان کی توجہ بالعموم زندگی کی مثبت اقدار اور صداقتوں پر رہتی ہے۔ وہ زندگی کی انہی صداقتوں کو فنی خوبیوں کے ساتھ تخلیقی انداز میں پیش کرتے ہیں۔ موضوعات کی رنگارنگی بھی اُن کے افسانوں کا خاص وصف ہے۔

سعادت حسن منٹو سے پہلے کا افسانہ تعقل کا افسانہ ہے۔ منٹو سے تخیل کے افسانے کا آغاز ہوتا ہے۔ صحیح معنوں میں پاکستانی افسانے کی بنیاد منٹو نے ہی رکھی ہے۔ بالخصوص ان کا افسانہ ''کھول دو'' ہر حوالے سے پاکستانی افسانہ کہلائے جانے کا حق دار ہے۔ منٹو نے ہمارے افسانے میں ایک ایسے تناظر کی تشکیل کا آغاز کیا ہے جس میں عقل کے ساتھ ساتھ غیر عقلی عناصر بھی موجود تھے۔ عالمی ادب میں پاکستانی افسانے کی پہلی بڑی شناخت منٹو ہی ہیں۔ وہ سفاک حقیقت پسند افسانہ نگار ہیں جنھوں نے زندگی کو اُس کی کلیت میں دیکھنے کی کامیاب سعی کی ہے۔ ممتاز مفتی نے موضوع، مواد اور تکنیک ہر اعتبار سے پاکستانی افسانے کو ایک نیا موڑ دیا ہے۔ پاکستانی افسانے میں نفسیاتی مسائل خصوصاً لاشعور اور تحت الشعور کی کیفیات کو سب سے پہلے ممتاز مفتی نے برتا ہے۔ ان کے بیشتر افسانے ایک اعتبار سے علامتی افسانے بھی کہے جاسکتے ہیں کہ ان کی ظاہری سطح معنوی سطح سے یکسر مختلف ہے۔

عزیز احمد نے تاریخ اور اساطیر کو افسانوی وقوعہ کے طور پر پیش کرنے کا تجربہ کیا ہے۔ پاکستانی افسانے کو انھوں نے نئے اسالیب اور بالکل نئے موضوعات سے متعارف کرایا ہے۔ میرزا ادیب کی افسانہ نگاری خوابوں کی دنیا سے حقیقت کی جانب سفر کا نام ہے۔ انھوں نے ابتدأ سجاد حیدر یلدرم، خلیقی دہلوی اور نیاز فتح پوری کے اسلوب سے متاثر ہو کر افسانے لکھے۔ ''صحرانورد کے خطوط'' اور ''صحرانورد کے رومان'' اپنے زمانے میں سب سے زیادہ پڑھے جانے والے افسانوی مجموعے تھے اور یہ میرزا ادیب کا بہترین ادبی تعارف ہیں۔

انتظار حسین نے 1947ء کے لگ بھگ لکھنا شروع کیا۔ آزادی کے بعد شہرت پائی اور چند برسوں کے اندر افسانہ نگاری کی تاریخ میں ایک انمٹ نقش بنا لیا۔ عصری میلانات اور حال کے تقاضوں کا جتنا شعور انتظار حسین کو ہے شاید ہی کسی کو ہوگا۔ ان کے افسانوں کی فضا اساطیری اور داستانوی ہے اور اس میں وہ خاصے کامیاب رہے ہیں۔ ان کا مشہور افسانہ ''آخری آدمی'' پاکستانی ادب کا پہلا علامتی افسانہ ہے۔

اشفاق احمد کے افسانوں میں صبا کے ہاتھ کی نرمی

پروفیسر محمد منور مرزا

ناصر کاظمی

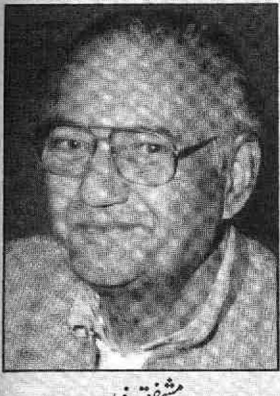
مشفق خواجہ

اور قوسِ قزح کے ساتوں رنگ موجود ہیں۔ شوکت صدیقی کے افسانوں میں خارجی ماحول کی عکاسی اور موجودہ دور کے سماجی معاشی مسائل کی تصویر کشی ملتی ہے۔ ابراہیم جلیس اُن پاکستانی افسانہ نگاروں میں سے ہیں جن کی تخلیقات خاص اور عام دونوں طبقوں میں یکساں مقبول ہیں۔ انھوں نے ''زرد چہرے''، چالیس کروڑ بھکاری اور تکونا سورج'' جیسے مجموعوں میں زندگی کے تضادات کو غیر جذباتی مگر تخلیقی انداز میں پیش کیا ہے۔ شفق کے سائے، بندگلی اور نغمہ اور آگ'' میں شامل افسانوں کا موضوع اخلاقی اقدار کی پاسداری ہے۔ غلام الثقلین نقوی کے یہ افسانوی مجموعے محبت اور اُنس کے جذبات کو فروغ دینے کی قابل قدر کاوش ہیں۔ پاکستانی افسانوی ادب میں غلام عباس کی انفرادیت یہ ہے کہ انھوں نے کسی کی تقلید یا پیروی سے گریز کرتے ہوئے اپنی دنیا آپ تخلیق کی ہے۔ اُن کے افسانوں میں زبان وبیان یا فکر وخیال کی وہ سطحیت کسی دور میں بھی پیدا نہیں ہونے پائی جو تخلیق کو اپنے اعلیٰ منصب سے نیچے لے آتی ہے۔ تعداد میں کم ہونے کے باوجود غلام عباس کے افسانے معیار اور مقبولیت میں بہت اونچے مقام پر فائز ہیں۔

شفیق الرحمٰن نے ایک مزاح نگار کی حیثیت سے بہت شہرت پائی حالانکہ اگر ہم فنی لحاظ سے دیکھیں تو ان کی وہ تمام تحریریں جن میں مزاح کی چاشنی موجود ہے دراصل زبردست افسانے ہیں۔ مسعود مفتی اور محمد منشا یاد نے سماجی حقیقتوں کو ایک باریک بین نقاد کی حیثیت سے دیکھا اور دکھایا ہے۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے حوالے سے دونوں افسانہ نگاروں نے یادگار افسانے تخلیق کیے ہیں۔ علامتی افسانہ نگاروں میں رشید امجد، احمد ہمیش، انور سجاد، مرزا حامد بیگ اور محمد مظہر الاسلام کا تخلیقی کام تفصیلی مطالعے کا متقاضی ہے۔ احمد داؤد نے پاکستانی افسانے میں ایک نیا لحن تخلیق کیا ہے۔

اسلم سراج الدین (سرسامر) اسد محمد خان، رفاقت حیات، علی اکبر ناطق کی سطح کے افسانہ نگاروں نے پاکستانی افسانے کو نئی جہتوں سے روشناس کرایا ہے۔ ہماری خواتین افسانہ نگاروں میں بانو قدسیہ، خدیجہ مستور جن کا 1965ء کی جنگ کے حوالے سے افسانہ (ٹھنڈا میٹھا پانی) بالخصوص بہت اہم ہے۔ ہاجرہ مسرور، رضیہ فصیح احمد، جمیلہ ہاشمی، نشاط فاطمہ، الطاف فاطمہ، فرخندہ لودھی، نثار عزیز بٹ، خالدہ حسین، زاہدہ حنا، طاہرہ اقبال اور شہناز شورو کا پاکستانی افسانوی ادب کے لیے (Contribution) قابل تحسین ہے۔ ان خواتین افسانہ نگاروں نے نسائی جذبات اور احساسات کی بھرپور نمائندگی کی ہے۔

ممتاز مفتی

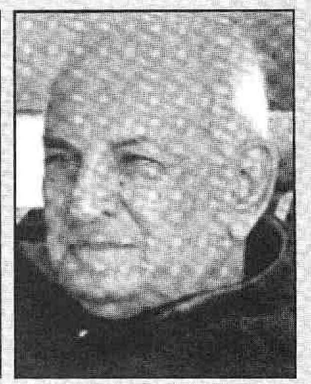
عبدالعزیز خالد

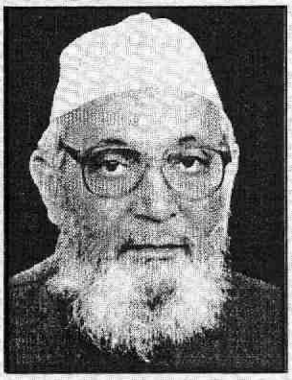
حفیظ تائب

اظہار کی متنوع جہات کے لحاظ سے پاکستان میں لکھا جانے والا افسانہ آج کے انسان کے احساساتی مدوجزر اور سیال جذباتی کیفیات کا آئینہ دار، حیاتِ انسانی کے نئے منطقوں کی دریافت اور کہانی کاری کے دھنک رنگوں سے مزین ہے۔

سفر نامہ

سفر نامہ پاکستانی ادب کی مقبول ترین صنف نثر قرار دی جاسکتی ہے۔ پاکستان میں لکھے جانے سفرنامے کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اس صنف میں بے پناہ فنی، موضوعاتی اور اسلوبیاتی تنوع موجود ہے۔

قیامِ پاکستان کے بعد صنفِ سفر نامہ کو اپنی توجہ کا مرکز بنانے والوں میں محمود نظامی اور بیگم اختر ریاض الدین کو اولیت حاصل ہے۔ محمود نظامی کا سفرنامہ ''نظر نامہ'' پاکستان میں سفرنامہ نگاری کا نقطۂ آغاز ہے۔ یہ سفرنامہ حقیقت اور تخیل کا خوبصورت امتزاج ہے۔ محمود نظامی بڑی مہارت سے نادر تشبیہات سے کام لے کر قاری کے ذہن کو اپنے مشاہدات کے قریب پہنچا دیتے ہیں۔ پاکستانی سفرنامے میں دوسرا بڑا نام بیگم اختر ریاض الدین کا ہے۔ ''سات سمندر پار'' اور ''دھنک پر قدم'' میں وہ ایک ایسے سیاح کے روپ میں سامنے آئی ہیں جو خاصی پڑھی لکھی ہونے کے ساتھ ساتھ نیم رومانی طرزِ فکر کی حامل ہیں۔ انھوں نے کسی مقام کو سطحی نظر سے نہیں دیکھا۔ وہ کسی منظر سے بے نیازانہ نہیں گزر گئیں۔

جمیل الدین عالی نے اپنے سفرناموں ''دنیا میرے آگے اور تماشا میرے آگے'' میں ادب کے کلاسیکی پس منظر کو زندگی کے موجودہ مناظر سے مربوط کیا ہے۔ انھوں نے اپنے سفرناموں میں پاکستانی تشخص کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ ممتاز مفتی کے تین سفرنامے ''لبیک'' ہند یاترا اور شاہراہِ ریشم قابل ذکر ہیں۔ بالخصوص ''لبیک'' سفرنامہ حج کے سفرنامے کی تاریخ میں انوکھی نوعیت کا سفرنامہ ہے۔ حج کے دوران میں جو سوالات ان کے خانۂ دل میں سر ابھارتے رہے انھوں نے ان کا برملا اظہار کر دیا ہے۔

ابن انشا کی مزاح نگاری اُن کے سفرناموں میں پورے عروج پر نظر آتی ہے۔ چلتے ہو تو چین کو چلیے؟ آوارہ گرد کی ڈائری، دنیا گول ہے، اور ابن بطوطہ کے تعاقب میں، ابن انشاء کے لکھے سفرنامے ہیں۔ حرکت، تنوع، ندرت اور لطافت ان سفرناموں کے بنیادی اجزا ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ صنفِ سفرنامہ نگاری کا سب سے اہم نام ہے۔ پاکستان میں سفرنامہ نگاری کی تاریخ اُن کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔ تارڑ کا پہلا سفرنامہ ''نکلے تری تلاش میں''، وطن عزیز میں سفرنامہ کے حوالے سے ایک ادبی دھماکہ ثابت ہوا۔ اس کے بعد پے درپے ان کے سفرنامے شائع ہونے لگے۔ ان کا شمار بیسٹ سیلر سفرنامہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ تارڑ کا اسلوب تحریر اس قدر دلکش اور دل نشیں ہے کہ اس کے طلسماتی حصار سے باہر نکلنا دشوار ہو جاتا ہے۔ تارڑ نے پاکستان کے شمالی علاقوں کے جو سفرنامے تحریر کیے ہیں پاکستان شناسی کے ضمن میں بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ شفیق الرحمٰن نے اپنے سفرنامے دجلہ اور برساتی میں اپنے مخصوص رومانی اسلوب میں اپنے مزاحیہ کرداروں کی مدد سے شگفتگی کی فضا پیدا کی ہے۔ ان کا سفرنامہ ''برساتی'' سفرنامہ نگاری میں ایک اہم سنگ میل ہے۔ عطاالحق قاسمی کے تمام سفرنامے شگفتہ نگاری کی عمدہ مثالیں ہیں۔ ''گوروں کے دیس میں'' سے لے کر ''دنیا خوبصورت ہے'' تک ان کے سفرنامے ندرت اور تازگی کے بہترین نمونے ہیں۔ وہ اپنے مخصوص ہلکے پھلکے انداز میں غیر ملکی معاشرت پر تبصرہ

کرتے ہوئے اپنے وطن میں رہنے کی برکات سے بھی آگاہ کرتے ہیں۔ سفر نامے کی صنف میں قاسمی نے پیروڈی کا بہت خوبصورت استعمال کیا ہے۔

سنجیدہ اور متین سفر ناموں میں مختار مسعود کے دو سفر نامے ''سفر نصیب'' اور لوح ایام'' کا تذکرہ ناگزیر ہے۔ یہ دونوں سفر نامے انشا پردازی کے بہترین نمونے ہیں۔ سفر کے زمانی اور مکانی طول وعرض' لطف سفر کے دلچسپ بیان' دوران سفر ملنے والے انسانوں کے دلچسپ مکالمے' اشیائے دیدنی سے لے کر اشیائے خوردنی تک کی مصوری' حالات و واقعات پر نکتہ سنجانہ تبصرے اور کتاب کے پہلے صفحے سے لے کر آخری صفحے تک ہمواری کے ساتھ چلنے والی انشا پردازی کے اعتبار سے اُردو کا کوئی دوسرا سفر نامہ ''سفر نصیب'' کے برابر نہیں رکھا جاسکتا۔ انقلاب ایران پر ''لوح ایام'' بڑی مستند اور دلچسپ ادبی دستاویز ہے۔

''اجنبی اپنے دیس میں'' لکھنے سے قبل سید شوکت علی شاہ کی کوئی ادبی حیثیت نہیں تھی لیکن انھوں نے یہ سفر نامہ لکھ کر ادبی دنیا میں تہلکہ برپا کردیا۔ یہ وطن عزیز کے کسی پسماندہ علاقے یعنی (بلوچستان) پر لکھا جانے والا واحد سفر نامہ ہے۔ پاکستانی ادب کا کوئی طالب علم بھی اس سفرنامے سے صرف نظر نہیں کرسکتا۔ اس سفر نامے میں ایک زندہ سانس لیتا ہوا بلوچستان دکھائی دیتا ہے۔ شیخ منظور الٰہی کا سفر نامہ ''نیرنگ اندلس' تاریخ کی راہداریوں اور غلام گردشوں میں سفر کرتے مسافر کی روداد سفر ہے۔ نیرنگ اندلس' مسلم سپین کے عروج وزوال کی دردناک کہانی ہے۔ جزئیات نگاری' خوبصورت تلمیحات اور دلکش انداز نگارش کے حوالے سے یہ سفر نامہ نئے سفر نامہ نگاروں کے لیے چراغ راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ بھارت کے بارے میں محمد اجمل نیازی کا سفر نامہ 'مندر میں محراب' اور ثریا حفیظ الرحمٰن کا ''جس دیس میں گنگا بہتی ہے'' نہایت اہمیت کے حامل اور قابل مطالعہ سفر نامے ہیں۔

پاکستانی سفر نامہ نگاری میں نئے آفاق دریافت کرنے والوں میں جن سفر نامہ نگاروں کو شمار کیا جاسکتا ہے ان میں اسلم کمال (گمشدہ) اور ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی (پوشیدہ تیری خاک میں) قابل ذکر ہیں۔ ان دونوں سفر ناموں کا اسلوب تحریر نکھرا اور ستھرا ہوا سادہ اور برجستہ ہے۔ داؤد طاہر کے تمام سفر نامے مشاہدات کی وسعت اور معلومات کی گہرائی کا نہایت اعلیٰ نمونہ ہیں۔ مطالعے کی گہرائی اور تجزیے کی گیرائی ان کے سفر ناموں کی نمایاں خوبیاں ہیں۔ تقی عثمانی' اکمل علیمی اور علی سفیان آفاقی کے سفرنامے اس صنفِ نثر میں گراں قدر اضافے ہیں۔

ہماری خواتین سفر نامہ نگاروں میں بشریٰ رحمٰن' سلمیٰ اعوان' فردوس حیدر' بشریٰ اعجاز' پروین عاطف اور ڈاکٹر عشرت ریحانہ شامل ہیں۔

انشائیہ

انشائیہ خالصتاً پاکستانی صنف نثر ہے۔ قیام پاکستان کے تقریباً چودہ سال بعد ڈاکٹر وزیر آغا کے انشائیوں کا پہلا

منیر نیازی

احمد فراز

مستنصر حسین تارڑ

مجموعہ خیال پارے'' شائع ہوا۔ اس مجموعے کو ہم پاکستان میں انشائیہ نگاری کا آغاز قرار دے سکتے ہیں۔ اُن کے انشائیوں کا کلیات پگڈنڈی سے روڈ رولر تک شائع ہوچکا ہے۔ جس میں ان کے انشائیوں کے چار مجموعے شامل ہیں۔ مشکور حسین یاد کی کتاب ''جوہر اندیشہ'' اور نظیر صدیقی کی کتاب ''شہرت کی خاطر'' بھی انشائیوں کے مجموعے ہیں۔ ہم ان دونوں کتابوں کو پاکستان میں صنف انشائیہ کے تدریجی ارتقا کی تاریخ میں نظرانداز نہیں کرسکتے۔ جمیل آذر اور مشتاق قمر نے انشائیہ کو اس کے ابتدائی دور میں خون جگر فراہم کیا۔ بالخصوص جمیل آذر نے بڑی سنجیدگی سے اس صنف کو اپنایا اور اپنی توجہ کا مرکز مرکز بنایا۔ انور سدید کے لکھے انشائیوں کا مجموعہ ''ذکر اُس پری وش کا'' اس صنف میں ایک زریں اضافہ ہے۔ اکبر حمیدی نے متعدد خوبصورت انشائیے تحریر کیے اور اس کے فروغ میں اپنا کردار ادا کیا۔ غلام جیلانی اصغر کے لکھے انشائیوں کا مجموعہ ''نرم دم گفتگو'' برجستہ اور بے ساختہ انشائیوں کا خوبصورت مجموعہ ہے۔

ہمارے دیگر قابل ذکر انشائیہ نگاروں میں ارشد میر' رشید احمد گوریجہ' شہزاد قیصر' حسرت کاسگنجوی' بشیر سیفی' امجد طفیل' شعیب خالق' انجم انصار' جان کاشمیری' محمد حنیف باوا' سلیم آغا قزلباش اور ناصر عباس نیر شامل ہیں۔ اس تحریر میں ہم نے پاکستان میں لکھے جانے والے انشائیہ کے اُنہتر سالوں پر مشتمل بکھری خوشبوؤں کو گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے۔ پاکستان میں بلاشبہ آج انشائیہ تخلیقی صف نثر کے طور پر اپنا وجود منوا چکا ہے۔

تنقید

تقسیم کے وقت پاکستان کو اُردو تنقید کی جو روایت ورثے میں ملی اس میں بیک وقت تین بڑے تنقیدی دھارے رواں دواں تھے۔ ان میں ایک اہم دھارا مشرقی تنقید کا تھا جس کا رخ یکسر مختلف سمت میں تھا۔ یہ دھارا تنقید کے قدیم چشموں سے قوت حاصل کررہا تھا۔ دوسری طرف حلقہ ارباب ذوق اور ترقی پسند تنقید کے دو اہم تنقید دھارے تھے جو ایک دوسرے کے متوازی بھی تھے اور باہم متصادم بھی۔ ترقی پسند تنقید اور حلقہ ارباب ذوق کی تنقید کا آغاز بیسویں صدی کی چوتھی دہائی کے آخری نصف میں ہوتا ہے۔ قیامِ پاکستان کے وقت ان کی عمر کم لیکن کردار بہت مضبوط تھا جب کہ مشرقی تنقید کی روایت برسوں پرانی تھی۔ عربی اور فارسی کی قدیم تنقیدی روایت پر قائم ہونے والی اس تنقیدی فکر کا کردار ادب میں اس وقت تک بہت اہم رہا جب تک اردو تنقید مغربی تنقیدی افکار سے پوری طرح آگاہ نہیں ہوئی تھی۔ اُردو دنیا مغرب کے جدید تنقیدی نظریات اور تنقید کے کردار میں وقوع پذیر ہونے والی تبدیلیوں سے آشنا ہوئی تو احساس ہوا کہ مشرقی تنقید کے پیمانے اب زیادہ کارآمد نہیں رہے۔ معلوم ہوا کہ علم عروض وقوافی اور زبان وبیان کے اصولوں پر کسی فن پارے کی قدر وقیمت کا تعین اور اس کی سادہ توضیح وتشریح تنقید کا اصل وظیفہ نہیں بل کہ تنقید کا منصب اس سے بہت بلند اور مقصد بہت اونچا ہے۔ ہمارے ہاں تنقید کی روایت کو مستحکم کرنے اور اسے مضبوط بنیادیں فراہم کرنے میں مشرقی تنقید نے مرکزی اور بنیادی کردار ادا کیا تھا۔ ترقی پسند تنقید'

رومانی تنقید اور نفسیاتی تنقید کا آغاز اُردو میں ایک دم نہیں ہوگیا تھا جن بنیادوں پر ان کی عمارت استوار ہوئی۔ مشرقی تنقید برسوں ان کی پرورش کرتی رہی تھی۔ ہمارے مشرقی ناقدین نے براہِ راست عمرانیات اور نفسیات جیسے علوم سے استفادہ نہیں کیا لیکن انہی مشرقی ناقدین کے ہاں بہت پہلے سے ادب پاروں کو عمرانی اور نفسیاتی زاویوں سے پرکھنے کے عمل کے آثار موجود تھے۔ مشرقی تنقید نے نظری تنقید کے مباحث پر جو کام کیا اس سے اُردو تنقید کی روایت کو بہت تقویت ملی۔ یہ درست ہے کہ مشرقی ناقدین نے مغرب کے تنقیدی نظریات سے استفادہ نہیں کیا۔ اگر وہ مغربی ادب کا براہِ راست مطالعہ کر کے اس کا اطلاق اُردو ادب پر کرتے تو یقیناً آج اُردو تنقید، مغرب تنقید کے ہم پلہ نہیں تو اس کے قریب ضرور ہوتی۔

پاکستان میں اُردو تنقید کے لیے سب سے زرخیز زمانہ قیامِ پاکستان کے بعد کے چند برسوں کا ہے جب تنقیدی سفر میں ایک ساتھ کئی تنقیدی رجحانات اور رویے شامل ہوئے۔ اس کے بعد تنقید کا یہ سفر جاری تو رہا مگر سست روی کا شکار رہا۔ تاہم چند ایسے بڑے نقاد ضرور پیدا ہوئے جنھوں نے اپنی آزاد فکر سے تنقیدی روایت کو اہم فکری موڑ

حسین، جمیل الدین عالی، اختر امان، اظہر جاوید، ڈاکٹر انور سدید، پروین شاکر، انوار فیروز، خالد احمد، طاہر مسعود، ظفر اقبال، محمد اظہار الحق، حسن نثار، جاوید چودھری، محمد یونس بٹ، تسلیم احمد تصور اور عمران نقوی شامل ہیں۔

میرزا ادیب کے کالموں کا اسلوب معروضی، باوقار، سنجیدہ اور نہایت دیانتدارانہ ہوتا تھا۔ وہ ادبی شخصیات اور کتابوں کے بارے میں بڑی مدلل اور متوازن رائے کا اظہار کرتے تھے اور قابل تعریف ادبی کام کی تحسین میں بخل سے کام نہیں لیتے تھے۔

پاکستان میں کالم نگاری سے وابستہ چند ایک مزید قلمکار جن کا اسلوبِ تحریر خالصتاً ادبی نوعیت کا رہا ہے ان میں انیس ناگی، کشور ناہید، ہارون الرشید، بشریٰ رحمٰن، امجد اسلام امجد، امیر نواز نیازی اور اعتبار ساجد قابل ذکر ہے۔

ملاقات نگاری

ملاقات نگاری یا انٹرویو درحقیقت صحافت کی ایک اہم صنف ہے مگر اب یہ ایک ادبی صنف بھی بن چکی ہے۔

قیامِ پاکستان سے لے کر اب تک ادبی ملاقات نگاری کا مکمل جائزہ لینا تو ممکن نہیں البتہ اس سلسلے میں شائع ہونے والی کتابوں اور چند ایک انٹرویو نگاروں کا انتہائی مختصر

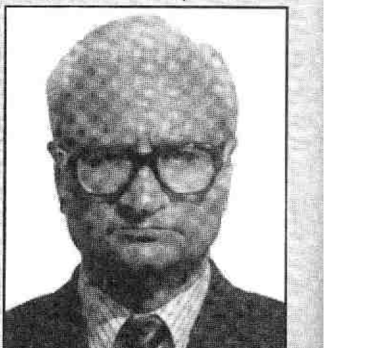

ڈاکٹر سلیم اختر

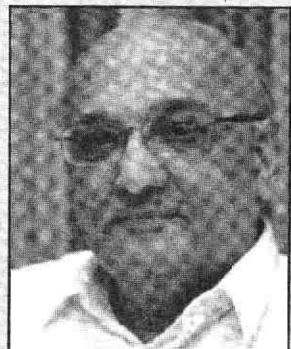

امجد اسلام امجد

بانو قدسیہ

عطا کیے۔ پاکستان میں اُردو تنقید کو بڑا نقصان نظریوں کی ادعائیت اور جذباتی وابستگیوں نے پہنچایا۔ اگر مغربی نظریات کی خامیوں پر وقت ضایع کرنے کے بجائے ان کی علمیاتی جہات سے استفادہ کیا جاتا تو صورت حال مختلف بھی ہوسکتی تھی۔

ادبی کالم نگاری

ہمارے ادبی کالم نگاروں میں چراغ حسن حسرت، ابراہیم جلیس، شورش کاشمیری، انعام درانی، شوکت تھانوی، میرزا ادیب، ابن انشاء، احمد ندیم قاسمی، رئیس امروہوی، مشفق خواجہ، منو بھائی، محمد اجمل نیازی، عطاالحق قاسمی، انتظار

تذکرہ کیا جاتا ہے۔ ادبی انٹرویوز پر مشتمل کتابوں میں طاہر مسعود کی ''یہ صورت گر خوابوں کے''، حسن رضوی کی ''گفت وشنید''، ''استفسار'' اور ''انداز گفتگو''، ندا فاضلی کی ''ملاقاتیں''، سیما مجید کی ''باتیں فیض سے''، محسن بھوپالی کی ''قومی یکجہتی میں ادب کا کردار''، عمران نقوی کی ''حرف ملاقات''، ازہر منیر کی عطاء الحق قاسمی کے طویل سوانحی انٹرویو پر مشتمل کتاب ''یہ نصف صدی کا قصہ ہے'' اور منور علی ملک کی ''پس تحریر'' شامل ہیں۔ تحسین فراقی کا مشفق خواجہ سے، گلزار جاوید کا اشفاق احمد سے اور آصف فرخی کا نیر مسعود سے انٹرویو اس صنف میں قابل ذکر اضافہ ہیں۔ ادبی انٹرویو کرنے والوں کی صف میں جن ناموں کا مزید اضافہ کیا جاسکتا ہے ان میں راغب شکیب، حامد سروش، راشد حمید، سیدہ حنا، قرۃ العین طاہرہ، منظر امکانی، محمد اجمل نیازی، تنویر ظہور، محمد افسر ساجد، خان ظفر افغانی، مبین مرزا اور اختر شمار وغیرہ شامل ہیں۔

تحقیق

قیامِ پاکستان کے وقت پاکستان میں اُردو تحقیق مولوی محمد شفیع، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر عندلیب شادانی کی کاوشوں سے ارتقا پذیر ہوئی۔ یہی بزرگ محقق تھے جنہوں نے تحقیق کے تسلسل کو اپنی ذاتی تحقیقی کاوشوں کے ذریعے قائم رکھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد اصولِ تحقیق و ترتیب و تدوین پر کام کا آغاز ہوا۔ ممتاز محقق ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان نے فنِ تحقیق کو اپنا موضوع بنایا۔ قریب قریب اسی عرصے میں بزرگ محقق ڈاکٹر عندلیب شادانی نے بھی اس موضوع پر اظہارِ خیال کیا۔ اُن کا مقالہ تحقیق اور اس کا طریقہ کار ''صحیفہ'' لاہور میں چھپا۔ ڈاکٹر افتخار حسین نے بھی اس موضوع سے اپنی دلچسپی کا اظہار کیا اور ایک دو تحریروں میں ایسے نکات پیش کیے جو ہر تحقیق میں معاون ہوسکتے ہیں۔

اصولِ تحقیق پر کام کرنے والے دوسرے محققین میں ڈاکٹر عبادت بریلوی اور ڈاکٹر سلطانہ بخش کے نام قابل ذکر ہیں۔ تحقیق کے حوالے سے اگر ہم لسانی تحقیق اور ادبی تحقیق کی ذیلی شقوں کے زیرِ عنوان پاکستان میں ہونے والے کام کا جائزہ لینا چاہیں تو صورتِ حال اس طرح ہوگی کہ لسانی تحقیق کے فن میں حافظ محمود شیرانی، مولوی عبدالحق، وحید الدین سلیم، نصیر الدین ہاشمی، سید سلمان ندوی کا کام نہایت قابل تعریف ہے۔ جدید لسانیات کے علم سے استفادے کے بعد ڈاکٹر محی الدین قادری، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، عبدالقادر سروری، ڈاکٹر مسعود حسین خان، ڈاکٹر شوکت سبزواری اور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے نام بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ڈاکٹر سبزواری نے اُردو کے ارتقا کو علمی اور سائنسی بنیادوں کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی اور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے جدید علم لسانیات کی روشنی میں اُردو کی لسانی تشکیل کا مطالعہ کیا۔

قیامِ پاکستان کے بعد اُردو کے آغاز کے موضوع پر سب اہم کام ڈاکٹر شوکت سبزواری نے کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے محمود شیرانی اور مسعود حسین خان دونوں کے نتائج تحقیق سے اختلاف کرتے ہوئے اپنا نظریہ پیش کیا ہے۔ لسانی تحقیق میں اُن کے کام کی وقعت اور قدر و قیمت سے انکار

نہیں کیا جاسکتا۔لسانی تحقیق کے ضمن میں عین الحق فرید کوٹی کی معتبر کتاب اُردو زبان کی قدیم تاریخ تحقیق کے نئے در وا کرتی ہے۔ اُردو کے آغاز کے بارے میں ڈاکٹر سہیل بخاری کا تحقیقی کام بھی نہایت اہمیت کا حامل ہے۔

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کی کتاب ''اُردو زبان میں قرآن و حدیث کے محاورات'' دو حصوں پر مشتمل ہے۔ حصہ اول میں قرآنی محاورات اور حصہ دوم میں حدیث سے ماخوذ محاورات کو اُردو میں استعمال کرنے کی روایت کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان نے اُردو کی اثر پذیری کے ساتھ ساتھ اثر اندازی کا بھی تحقیقی مطالعہ کیا ہے۔ان کا مقالہ ''فارسی پر اُردو کا اثر'' اپنے موضوع پر ایک جامع معلوماتی اور تحقیقی کارنامہ ہے۔ قدیم لغات میں اُردو الفاظ کی تحقیق بھی ایک اہم موضوع ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد اس موضوع پر سب سے پہلے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے توجہ دی ہے۔ پاکستان میں قواعد اُردو زبان پر بھی معیاری کام ہوئے ہیں۔اس ضمن میں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اور خلیل الرحمٰن داؤدی کی کاوشیں قابل قدر ہیں۔نسیم امروہوی اور وارث سرہندی نے اُردو لغت کے سلسلے میں قابل قدر تحقیقی کوششیں کی۔ اُردو ادب کی تاریخیں تحقیق کا سب سے اہم شعبہ ہے۔ پاکستان میں اس حوالے سے جو کام ہوا ہے اُن میں جامعہ پنجاب کی کئی جلدوں میں مرتبہ کتاب تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند ایک بڑا تحقیقی کارنامہ ہے۔حالیہ برسوں میں ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کی رہنمائی میں اس تحقیقی کام کو Update کر دیا گیا ہے اور اس کام کی ایک تلخیص بھی مرتب کر دی گئی ہے جو ادب کے طالب علموں کے لیے نہایت مفید ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کا زندۂ جاوید تحقیقی کارنامہ ''تاریخ ادب اُردو'' اب تک چار جلدوں میں سامنے آیا ہے۔تاریخ، تنقید اور تحقیق کا امتزاج یہ کام پاکستانی تحقیق کے لیے ایک طرۂ امتیاز ہے۔ ڈاکٹر انور سدید کی اُردو ادب کی مختصر تاریخ اور ڈاکٹر سلیم اختر کی اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ اگرچہ مختصر ترین نہیں ہیں لیکن اپنے مندرجات اور مشمولات کے لحاظ سے قابل صد تحسین کاوشیں ہیں۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے بھی اُردو ادب کی تاریخ قلمبند کی ہے جس کی ایک جلد ہمارے سامنے ہے۔

ہمارے ہاں کلاسیکی متون کی تدوین و بازیافت میں خلیل الرحمٰن داؤدی نے بڑا وقیع کام کیا ہے۔1969ء میں غالب کی صد سالہ تقریبات کی مناسبت سے غالب پر کئی اہم تحقیقی کام ہوئے بالخصوص غالب کے تمام آثار کو مجلس یادگارِ غالب جامعہ پنجاب نے سلیقے اور نفاست سے شائع کیا۔اس ضمن میں پروفیسر حمید احمد خان، ڈاکٹر وحید قریشی اور سید قدرت نقوی نے گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔ مشفق خواجہ نے ''جائزہ مخطوطات اُردو'' کی جلدوں میں جو فنون متعارف کرائے ہیں وہ پاکستان میں ہونے والے تحقیقی کام کی اہم جہت ہیں۔ پاکستان میں قدیم ادبی شخصیات میں سے دکنی شخصیات پر بالخصوص زیادہ تحقیقی کام ہوا ہے۔اس ضمن میں سخاوت مرزا نے نمایاں اور مستقل کام کیا ہے۔ قدیم عہد کے بعض اہم شعراء پر مشفق خواجہ نے خاصی دل جمعی سے تحقیقی مقالات لکھے۔ بعد کے شعرا میں یاس یگانہ چنگیزی پر مشفق خواجہ کی تحقیقی کتاب ایک بڑا کارنامہ ہے۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے نظیر اکبر آبادی اور جرأت کے تفصیلی تحقیقی مطالعے اپنی کتابوں میں پیش کیے ہیں۔اُن کی محنت، دقتِ نظری اور ژرف نگاہی کی داد دینا پڑتی ہے کہ کوئی اہم پہلو ان شخصیات کے حوالے سے نظر انداز نہیں ہونے پایا۔کلب علی خان فائق نے مومن کی کلیات مدون کی ہے اور ان کے حالاتِ زندگی اور شاعری پر مفصل کتاب قلمبند کی ہے۔ ذوق پر ڈاکٹر تنویر احمد علوی کا تحقیقی مقالہ اور ان کا مرتبہ کلیات پاکستان میں چھپے۔ غالبیات پر ایک جامع اشاریہ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے مرتب کیا۔ یہ غالب کی تمام دستیاب مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تصانیف کا تفصیلی تحقیقی تذکرہ ہے۔ مسلم ضیائی بلاشبہ پاکستان کے ایک معتبر ماہر غالبیات ہیں۔انہوں نے اپنے تحقیقی مقالات اور اس موضوع پر اپنی دیگر کاوشوں سے غالبیات میں مفید اضافے کیے۔ مولوی نذیر احمد کی زندگی قومی وادبی خدمات پر پہلی جامع اور محققانہ تصنیف ڈاکٹر افتخار صدیقی کی ''مولوی نذیر احمد دہلوی، احوال و آثار'' ہے۔ محمد حسین آزاد پر محققین نے خاطر خواہ توجہ دی ہے بالخصوص ڈاکٹر محمد صادق اور ڈاکٹر اسلم فرخی کی تحقیقی تصانیف تحقیق کے تمام تر تقاضوں سے عہد برآ ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ ڈاکٹر سہیل بخاری، ڈاکٹر عبدالسلام اور ڈاکٹر ممتاز احمد خان نے اُردو ناول پر بہت عمدہ تحقیقی کام سرانجام دیا ہے۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خان اب بھی اپنے تحقیقی کام کو مسلسل Update کرتے رہتے ہیں۔ دینی ادب پر پروفیسر خورشید احمد اور ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کے تحقیقی کاموں کو نظر انداز کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔ پاکستانی جامعات میں ڈگری کے حصول کے لیے معیاری اور غیر معیاری ہر طرح کی تحقیق کا سلسلہ جاری ہے۔

عطاء الحق قاسمی

بشریٰ رحمٰن

ڈاکٹر محمد اجمل نیازی

اقبالیات ہماری تحقیق کا پسندیدہ موضوع ہے۔ تخلیق پاکستان کے بعد مطالعۂ اقبال کو بہت زیادہ اہمیت حاصل رہی۔ گزشتہ اُنہتر برسوں کے دوران میں علامہ اقبالؒ بلاشبہ سینکڑوں کتابوں، مقالات، تحریروں اور تقریروں کا موضوع بنے ہوئے ہیں۔ اقبال فہمی اور اقبال شناسی ہمارے ہاں اب مستقل تحریک کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ علامہ کی زندگی، شاعری، خطبات، خطوط اور کیریئر شاید ہی کوئی گوشہ ایسا ہو جس کے بارے محققانہ مساعی نہ کی گئی ہوں۔

علامہ اقبالؒ کی سوانح پر ڈاکٹر جاوید اقبال کی کتاب ''زندہ رود'' ایک زندۂ جاوید تحقیقی کارنامہ ہے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال کے علاوہ بہت سے سوانح نگاروں نے علامہ اقبالؒ کی کلی یا جزوی سوانح عمریاں تحریر کی ہیں۔ علامہ اقبالؒ کی بہت سی یادداشتیں بھی شائع ہو چکی ہیں۔ علامہ اقبالؒ کے خطوط پر بھی خاصا تحقیقی کام ہوا ہے۔ ہمارے ہاں اقبالیات کا غالب حصہ علامہ اقبالؒ کے فکر و فلسفے کی تشریح و تعبیر اور تنقید و تجزیے پر مبنی ہے۔ اس حوالے سے پروفیسر مرزا محمد منور، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی اور ڈاکٹر تحسین فراقی کا کام بڑی وقعت کا حامل ہے اور اقبالیاتی ادب کے حوالے سے اس نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔